© rasailojaraid.com

دین کا جامع تصوّر[1]

سیّد قطب شہید

(ترجمہ: عبدالحمید صدیقی)

دین اور دنیا کی دوئی کا تصور یکسر غلط اور باطل ہے۔ دینِ حق انسانی زندگی کا ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس بنا پر وہ کبھی اپنے دائرۂ کار کو محض وجدانی کیفیات، بے جان اخلاقی ضابطوں، مذہبی رسوم، گیان دھیان کی مختلف ریاضتوں اور طور طریقوں تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ وہ کیسے زندگی کے محض ایک گوشے میں سمٹ کر رہ سکتا ہے جسے آج کل کی مذہبی اصطلاح میں ایک شخصی معاملہ کہا جاتا ہے؟ دینِ حق یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ باری تعالیٰ کو حیاتِ بشری کے ایک نہایت ہی کمزور حصّے کا حاکم مانا جائے اور باقی زندگی چھوٹے خداؤں کی سرپرستی میں بسر کی جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہونگے کہ انفرادی زندگی میں تو انسان خدا کے بتاتے ہوئے اخلاقی ضابطوں کا پابند ہو مگر اجتماعی زندگی میں وہ یا تو خود اپنی خواہشات کی پیروی کرے یا انسانوں کے وضع کیے ہوئے اصولوں کو اپنائے۔ پھر یہ بات بھی اسلام کے تصوّرِ دین کے خلاف

[1] یہ مضمون سید قطب شہیدؒ کی ایک معروف کتاب المستقبل لہٰذا الدین کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ ادارہ معارفِ اسلامی، کراچی شائع کر رہا ہے۔

(بقیّہ اشارات)

ص۔ قومیں جنہوں نے حیاتِ انسانی کا بٹوارہ کر کے اُس کے کچھ حصّے قیصر کو اور کچھ خدا کو دے دیئے ہیں۔ انہیں بھی سوچنا چاہیے کہ کیا یہ تقسیم غلط اور غیر فطری تو نہیں۔ اور کیا جن حصّوں کو وہ قیصر کے حصّے سمجھ کر اُن پر انسانوں کے قوانین نافذ کر رہے ہیں وہ خدا کی خدائی کی تکذیب اور اُس کے حقوق پر ڈاکہ تو نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ وہ انسان کو آخروی فلاح کا راستہ تو بتائے مگر اِس دنیا کے لیے اُسے کوئی رہنمائی نہ دے اور لوگ خلافتِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے یکسر بے پروا ہو کر امورِ دنیا کو جس نہج پر چاہیں چلاتے رہیں۔ دین کی یہ کمزور حیثیت یوں بھی خلافِ عقل ہے۔ لیکن اسلام جو اللہ کا سچا دین ہے وہ تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پست حیثیت کو گوارا نہیں کر سکتا۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ دین کس طرح دنیاوی معاملات سے بے تعلق ہوتا گیا۔

دین اور دنیا کی تفریق کا نظریہ یورپ سے دنیا کی دوسری قوموں کی طرف منتقل ہُوا ہے اِس باطل نظریے نے اہلِ یورپ کی بلکہ پوری انسانیت کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ یہ نظریہ دفعتاً ابھر کر سامنے نہیں آیا بلکہ تاریخ کے ایک لمبے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی رہنمائی و ہدایت کے لیے انبیاء بھی مبعوث فرمائے، اور انہیں کتبِ سماوی سے بھی نوازا۔ بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے خالقِ کائنات نے بکثرت پیغمبر بھیجے جنہوں نے انہیں حق اور صداقت کی راہ دکھانے کی پوری پوری کوشش کی مگر انہوں نے دھڑے بندیوں اور تعصبات میں گرفتار ہو کر اُن کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا مذہبی پندار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ان کے پاس جب حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر گئے تو وہ محض اس بنا پر ان کے دشمن بن گئے کہ انہوں نے اُن کی غلط روش پر انہیں ٹوکا۔ قرآن مجید حضرت مسیح کے پیغام اور دعوت کو یوں بیان کرتا ہے:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔ (آل عمران - ۵۰)	اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ دیکھو، مَیں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو[۱]

[۱] ہر نبی کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام بھی پچھلے انبیاء کی تردید و تغلیط نہیں کر رہے بلکہ حضرت موسیٰ اور ان کی شریعت کی تائید و توثیق کر رہے ہیں اور یہودیوں کو بتا رہے ہیں کہ میں شریعتِ موسوی کو مٹانے کے لیے نہیں آیا۔ ص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ خود کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ انہیں شریعتِ موسوی

بلکہ اُس کی تجدید کے لیے آیا ہوں۔ اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کے یہ ارشادات ملاحظہ ہوں:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔" (متی ۵-۱۷)

"آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطے کے مٹ جانے سے آسان ہے۔"

(لوقا ۱۶: ۱۷)

انجیلی زبان میں شریعت سے مراد شریعتِ موسوی ہی ہے۔

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیح سے پوچھا کہ احکامِ دین میں اولین حکم کونسا ہے۔ جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

"خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" (متی ۲۲: ۳۷-۴۰)

قرآن مجید اور انجیل کی مندرجۂ بالا تصریحات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر تشریف نہ لائے تھے بلکہ اُن کا کام شریعتِ موسوی کی تجدید تھا۔ اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ناروا پابندیاں اور قیود تمہارے علماء نے اپنی طرف سے تم پر عائد کر رکھی ہیں اُن کا بوجھ ہلکا کرنا میرے فرائضِ رسالت میں داخل ہے۔ چنانچہ انجیل میں حضرت عیسیٰ کا ارشاد ہے:

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دونگا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تجدید کی ذمہ داری ہی سونپی گئی تھی اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی کہ لوگوں کے اندر روح کی پاکیزگی، تقویٰ اور طہارت پیدا ہو۔ عبادات کے خارجی مظاہر پر زور دینے کے بجائے سیدنا مسیح علیہ السلام نے تعلق باللہ پر زور دیا۔ ان کے مقابلے میں یہودیوں کے نزدیک اصل اہمیت مذہب کے ظاہری اعمال اور مذہبی رسوم و قیود کو حاصل تھی۔ اور ان اعمال کی روح سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اس طرح یہودیوں اور مسیحیت کے علمبرداروں کے مابین آویزش نے جنم لیا۔ اس کشمکش نے بالآخر یہ خوفناک صورت اختیار کی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سُولی پر چڑھانے کے منصوبے تیار ہوئے مگر باری تعالیٰ نے یہودیوں کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ یہودیوں کی اس شرارت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت کا دم بھرنے والوں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کے درمیان منافرت اور کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور ان دونوں نے ایک دوسرے سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ تعلقات کی یہ کشیدگی مذہب پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں نے اپنی کتاب انجیل کو بھی دوسری کتب مقدسہ سے الگ کر کے صرف اس کی پیروی پر اکتفا کیا اور باقی کتب کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ وہ ان کو پڑھتے ضرور ہیں مگر ان کے

۳۔ تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جوا نرم ہے اور میرا بوجھ ہلکا ہے"۔ (متی ۱۲: ۲۳-۲۵)

جس امر کی طرف سید قطب شہیدؒ نے سرسری اشارہ کیا ہے اُسے میں نے قدرے صراحت کے ساتھ اس لیے بیان کیا ہے کہ یہ نکتہ اُن کی ساری بحث کا مدار ہے۔ وہ دراصل ثابت یہ کر رہے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں دین اور دنیا کی تفریق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ شریعتِ موسوی کے ہی پیرو اور مجدد تھے، مگر جب یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان دشمنی شدت اختیار کر گئی تو نصرانیوں نے شریعتِ موسوی کو "لعنت" قرار دے کر چھوڑ دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امورِ دنیا کے متعلق عیسائیوں کے پاس سرے سے کوئی آسمانی ضابطۂ اخلاق باقی نہ رہا اور عیسائیت بندے اور خالق کے درمیان محض ایک نجی تعلق بن کر رہ گئی (مترجم)

لہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ شریعت موسوی اپنی جگہ پر موجود ہونے کے باوجود یہودیوں کی زندگی پر کوئی پاکیزہ اثر مترتب نہیں کر رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کے دلوں سے محبت الٰہی ختم ہو گئی تھی اور وہ باطنی پاکیزگی جاتی رہی تھی جو کسی شریعت کی پیروی کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنا سارا زور لوگوں کے اندر یہی چیز پیدا کرنے پر صرف کیا۔ (مترجم)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی حکم کی پیروی نہیں کرتے، نہ ہدایت کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کو سخت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی اسرائیل کی پوری شریعت تورات ہی میں موجود ہے اور اس کی تجدید کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اب جبکہ دینِ مسیحی کے علمبرداروں نے شریعت موسوی کا مقاطعہ کیا تو اُن کے پاس ایسی کوئی شریعت باقی نہ رہی جو تعلق باللہ کی اساس پر اُن کی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل کرتی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ وہ اعتقادی تصورات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے وہ بھی بدقسمتی سے جوں کے توں محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر وہی زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ جاتے تو کم از کم ایک ایسا نظامِ فکر تو معرضِ وجود میں آتا جس میں اس کائنات کے اندر انسان کے مرتبہ و مقام کو مشخص اور اُس کی زندگی کے مقاصد کو متعین کیا جا سکتا تھا اور اس طرح اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے کوئی صحیح بنیاد فراہم ہو سکتی۔ نیز اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ عیسائیوں کے اہلِ علم خدائی ہدایت کی ضرورت محسوس کر کے شریعتِ موسوی کی طرف پھر رجوع کرتے اور علماءِ یہود کی خود ساختہ پابندیوں سے الگ کر کے اصل شریعت کے احکام اس میں سے چھانٹ لیتے۔ مگر اس کے برعکس عالمِ واقعات میں ہُوا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو یہودیوں اور رومی بُت پرستوں کے ہاتھوں شدید مصائب اُٹھانے پڑے اور وہ بیچارے اس بات پر مجبور ہوئے کہ دعوتِ دین کا کام چھپ چھپا کر ان ظالموں کی نظروں سے بچتے ہوئے کریں۔ ان سنگین اور ناساعد حالات میں انہوں نے انجیل کی بعض نصوص اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی میں بعض تبدیلیاں کر دیں اور تبدیلی کا یہ عمل اِس تواتر کے ساتھ جاری رہا کہ تعلیماتِ ربّانی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ذاتی تاثرات اور خیالات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ اب ان میں تمیز کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ پھر راویوں کے اختلاف کی وجہ سے انجیل کے مندرجات میں بھی اختلاف رونما ہُوا، اور اس طرح متعدد اناجیل معرضِ وجود میں آئیں۔ ان اناجیل کی حیثیت کتب سماوی کی نہیں بلکہ روایات کے دفاتر کی سی ہے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے افکار و اعمال کو قلمبند کیا گیا ہے۔

یورپ میں مسیحیت پولوس (سینٹ پال) کے ذریعہ پہنچی۔ یہ شخص مسیحیت کا حلقہ بگوش بننے سے پہلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بت پرست تھا۔ اسے نہ تو حضرت مسیح کی صحبت نصیب ہوئی اور نہ اس نے اُن کی تعلیمات کو جاننے کی کوشش کی۔ اس نے رومی بت پرستی کے بہت سے غلط تصورات کو دینِ مسیحی میں شامل کرکے یورپ میں اُن کا پرچار شروع کر دیا۔ عیسائیت کی یہ دوسری بدنصیبی تھی کہ اُسے پولوس کی ذات میں ایک ایسا مبلغ ملا جو نہ تو مسیحی تعلیمات سے پوری طرح واقف تھا اور نہ دینی جذبہ و احساس کے اعتبار سے مخلص تھا۔ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے تقریباً سو سال بعد کئی ایک رسائل لکھے جن میں مذہبی معتقدات کے اندر فلسفیانہ موشگافیاں پیدا کرنے کے ڈھنگ بتلائے گئے تھے اور اُن کا عملی مظاہرہ بھی موجود تھا خصوصاً مسئلہ حلول کا تو یہ شخص زبردست داعی اور مبلغ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مسیح خدا کے بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے یعنی گنہگاروں کو اس کی عام طور پر یہ نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ کلمۃ اللہ کو اپنے اندر جذب کریں اور بخشش کے لیے اُس کی طرف رجوع کریں۔ وہ عوام کو انبیاء کی طرح بشارتیں دیتا اور کہتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام جلد ہی جب واپس آئیں گے تو وہ انہیں غیر معمولی عزو شرف سے بہرہ ور کریں گے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو "ہمارا خداوند یسوع مسیح" کہہ کر پکارتا اور اپنے آپ کو "رسول یسوع مسیح" کے معزز لقب سے ملقب کرتا۔

پولوس کی دعوت جب پھیلنے لگی تو لوگ غلطی سے اسے عیسائیت کی کامیابی و کامرانی سمجھ کر خوش ہوئے۔ پھر جب رومی شہنشاہ قسطنطین نے دینِ مسیحی کو قبول کیا تو عوام کے اندر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے یہ سمجھا کہ اب عیسائیت ایک حکمران طاقت بننے کی وجہ سے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کرے گی۔ ایک امریکی مفکر اپنی کتاب "دین اور علم" میں اسی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

"منافقین کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مسیحیت کے اندر شرک اور بت پرستی کے جراثیم داخل ہو گئے۔ یہ منافقین رومی حکومت کے بڑے بڑے بلند مناصب پر فائز ہونے والے اور خطیر معاوضے پانے والے عہدیدار تھے۔ بظاہر تو یہ مسیحیت کی محبت کا دم بھرتے تھے مگر ان سے اس دین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی دین سے ناواقفیت تھی اور دوسری وجہ ان کی منافقت۔ انہیں دینِ حق کے ساتھ مخلصانہ تعلق نہ تھا۔ خود قسطنطین اس جہالت اور منافقت کا پیکر تھا۔ اس کی پوری عمر ظلم اور فسق و فجور میں گزری اور عمر کے آخری چند برسوں کے سوا اُس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احکام دین کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اس نئے دور میں تثلیثِ مسیحی بظاہر بڑی طاقتور نظر آرہی تھی، کیونکہ بادشاہ قسطنطین اس کی غلامی کا دعویدار تھا، مگر درحقیقت اس کے اندر زبردست اضمحلال پیدا ہو چکا تھا اور اس بنا پر یہ بُت پرستی کا قلع قمع کرنے اور شرک کے جراثیم برباد کرنے میں سخت ناکام رہی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ فروعات تو ایک طرف رہیں، اس کے معتقدات اور بنیادی تصورات تک میں باطل کی آمیزش ہو گئی اور اس طرح مذہب کا ایک ایسا ملغوبہ تیار ہوا جس میں عیسائیت اور بُت پرستی کے اجزا شامل تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور عیسائیت کے درمیان بعد و بیگانگی شروع ہوتی ہے۔ اسلام شرک اور بُت پرستی کا دشمن ہے۔

یہ فرمانروا قسطنطین جو خالص دنیا پرست تھا، جو ہر معاملے کو ذاتی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا، اُس کی نظر میں دینی عقائد کی آخر کیا اہمیت اور ان کا کیا وزن ہو سکتا تھا۔ اُس نے ذاتی مفادات کے لیے دو متحارب گروہوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے متبعین اور بت پرستوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُس دور کے مخلصین اور دین سے گہری محبت رکھنے والوں نے اس غلط روش پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اُن کا یہ خیال تھا کہ دین کا یہ نیا مرکب چونکہ فطری طور پر غلط ہے اس لیے یہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو جائے گا اور بُت پرستانہ عقائد و نظریات خود بخود مٹتے چلے جائیں گے اور اس طرح دین پاک اور منزّہ ہو کر انسانوں کی رہنمائی کے لیے زندہ رہ جائے گا۔ مگر افسوس کہ مقدس مذہبی گروہ کی یہ توقعات توقعات ہی رہیں، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں۔ دینِ حق شرک اور بُت پرستی کی آلائشوں سے پاک نہ ہو سکا۔ توحید اور بت پرستی کی آمیزش میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور بعد میں مسیحی معتقدات اور تصورات پر سیاسی آویزش کی بھیانک پرچھائیاں پڑنے لگیں۔"

توحید اور بُت پرستی کی اس آمیزش کو مذہبی لحاظ سے کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دینی عقائد و نظریات کی کوئی ایسی تفسیر و تعبیر کی جائے جو مختلف اور متخالف گروہوں اور قوموں کے لیے قابلِ قبول ہو، جو کنفیوشنسٹ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ذہنی اطمینان کا باعث بن سکے۔ اس غرض کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۵۱ء میں خلقدونیہ (CHALCEDON) کے مقام پر عیسائیوں کا ایک زبردست اجتماع ہوا جس میں مسیح کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا کہ وہ کئی مختلف اور متضاد صفات کے جامع ہیں اور یہ صفات اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ اُن کی ذات کے اندر جمع ہیں۔ وہ الوہیت، بشریت اور روح کے مظہر ہیں اور اس طرح بیٹا، باپ اور روح القدس ایک ہی جسد میں جلوہ گر ہیں۔ اقانیم ثلاثہ کا تصور توحید پرستی اور بت پرستی کی آمیزش کی علامت ہے۔

فرقہ یعقوبیہ نے اس اعلان سے شدید اختلاف کیا۔ یہ گروہ ایک ذات کے اندر تین مختلف اور متضاد صفات کی یکجائی کا قائل نہ تھا۔ بلکہ اس ذات کو تین اقانیم کا مرکب و مجموعہ سمجھتا تھا۔ یہ اختلاف کافی مدت تک چلتا رہا۔ یعقوبی گروہ مصر و شام اور رومی سلطنت کے دُور دراز گوشوں میں کافی زور پکڑ چکا تھا۔ ہرقل نے ان کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کے لیے یہ نیا تصور دیا کہ مسیح ایک ہی طرح کی مشیت کا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جسدِ واحد کے اندر اگرچہ رجحانات مختلف اور متضاد ہیں مگر ان کے پیچھے ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔ ہرقل کی یہ تصریح جو مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان مفاہمت کی غرض سے پیش کی گئی تھی کامیاب نہ ہو سکی اور اس پر ہر گروہ نے اظہارِ اطمینان کرنے کے بجائے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات ستودہ صفات کے بارے میں یہ مختلف من گھڑت تصورات جو موحدین اور بت پرستوں کے دو متضاد خیالی گروہوں کے درمیان مصالحت کی غرض سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے مسیحیت کے لیے بڑے تباہ کن ثابت ہوئے۔ انہوں نے دینِ مسیحی کو صحیح اور غلط تصورات کا ایک ایسا ملغوبہ بنا دیا جس کے صحیح اجزا کو باطل سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک الہامی مذہب سے بدل کر عجیب و غریب اور پیچیدہ افکار و نظریات کا محض ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا تھا جس سے عوام کو دھوکے تو دیئے جا سکتے تھے مگر حق و صداقت کی راہ منور نہ کی جا سکتی تھی۔ اس دین میں اب وہ صلاحیت ہی باقی نہ رہی تھی جس سے خدا کے وجود کا صحیح تصور پیش کیا جا سکتا، خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت معلوم کی جا سکتی، یا صفاتِ الٰہی کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگایا جا سکتا، یا اس کی طرف رجوع کر کے یہ معلوم ہو سکتا کہ وجودِ انسانی کی حقیقت کیا ہے اس وجود کو کس مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم جب تک انسانی فطرت کے ان بنیادی اور اساسی سوالات کا ٹھیک جواب نہیں دے لیتے کسی کامیاب متوازن اور منظم اجتماعی زندگی کی تشکیل ممکن نہیں ہو سکتی۔

© rasailojaraid.com